© rasailojaraid.com

اے مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

(۲)

پروفیسر محمد اسلم، استاذ شعبۂ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی لاہور

شیر میوات علی محمد نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نور اللہ مرقدہٗ کی درگاہ میں
سہ رحیمیہ کا اجراء کیا۔ مفتی ضیاء الحق صاحب اس کے پہلے مہتمم مقرر ہوئے۔ میں
لیا تو مفتی ضیاء الحق نے موقع غنیمت جان کر مدرسے میں "شاہ ولی اللہ کی
ات" کے موضوع پر میری تقریر رکھ دی۔ اخبارات میں خبر شائع کرائی۔ ہینڈبل
تقسیم کئے گئے۔ صدارت کے لئے مفتی صاحب کا نام تجویز ہوا۔ میرے لئے یہ
ٹھن مرحلہ تھا۔ مفتی صاحب ایسے فاضلِ اجل کی صدارت میں مجھ ہیچمدان
تقریر ایک طرح سے میرا امتحان تھا۔ خیر یہ مرحلہ خدا کے فضل وکرم سے بخوبی
ر گیا۔ مفتی صاحب نے خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا اور مجھ کج مج بیان کی تعریف
بائی۔ شیر میوات نے بھی ایسے ہی الفاظ سے میری ہمت بندھائی۔ تقریر کے
کھانے کا اہتمام تھا۔ کھانے کے موقع پر بھی گفتگو ہوتی رہی۔ کھانے سے
رغ ہو کر میں اور مفتی صاحب ایک ہی رکشا میں سوار ہو کر ندوۃ المصنفین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی طرح ۱۹۶۳ء میں، مجھے اب تک یاد ہے جولائی کی ۱۲ تاریخ تھی، جناب حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی نے غالب اکیڈمی میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی خدمات کے بارے میں میری تقریر کروا دی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم کی صدارت میں یہ تقریب منعقد ہوئی۔ مفتی صاحب چند احباب کے ساتھ تشریف لائے۔ ادھر ہمدرد انسٹیٹیوٹ تغلق آباد سے ایک بس میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی، حکیم عبدالوہاب ظہوری، جناب عبدالحئی فاروقی، ڈاکٹر اوصاف علی، ڈاکٹر وحید الدین اور ادارے کے بہت سے رفقاء تشریف لائے۔ جامعہ ملیہ سے ڈاکٹر عابد حسین بھی آئے ہوئے تھے۔ اہل فکر و نظر کا اچھا خاصہ مجمع تھا۔ پاکستان میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو دو قومی نظریہ کا بانی مبانی سمجھا جاتا ہے اور بھارت کی سیکولر فضا میں ان کی تعلیمات اور خدمات کو پاکستانی نقطۂ نظر سے بیان کرنا آسان نہیں تھا۔ مفتی صاحب نے میری گھنٹہ بھر کی تقریر بڑے صبر و تحمل کے ساتھ سنی۔ جب خطبۂ صدارت کے بعد جلسے کا اختتام ہوا تو مفتی صاحب نے میری کج مج بیانی کی تعریف کی۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے یہ میری دلداری کے لیے کہا ہوگا، ورنہ ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل
نسیمِ صبح تیری مہربانی

ایک زمانے میں مجھے آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سننے کا بڑا شوق تھا۔ عموماً رات کی نشریات سنا کرتا تھا۔ ایک رات میں نے ریڈیو کھولا تو حضرت شاہ کلیم اللہ ولی شاہجہان آبادیؒ کے عرس کی جھلکیاں نشر ہو رہی تھیں اور مقررین کے خطاب کے اقتباسات پیش کیے جا رہے تھے۔ اچانک میں نے اناؤنسر سے کہا: آپ جناب مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے خیالات سماعت فرمائیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کی تقریر ٹیپ ریکارڈ پر ریکارڈ کر لی۔ اس میں موصوف نے الخلق عیال اللہ کے موضوع پر اظہار خیال فرمایا تھا۔

مصنفین کو ناشروں سے ہمیشہ یہ گلہ رہتا ہے کہ ناشرین انھیں حسب توقع رائلٹی نہیں دیتے۔ ناشروں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اگر وہ مصنفین کی کتابیں شائع نہ کریں تو انھیں علمی حلقوں میں کون جانتا؟ ان کے لئے یہی کافی ہے کہ ان کی تصانیف چھپ کر علمی حلقوں میں چلی جائیں۔ یہ کشمکش ہمیشہ رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

مجھے یہ معلوم نہیں کہ مفتی صاحب کا اپنے مصنفین کے ساتھ کیسا سلوک تھا۔ جہاں تک مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کا معاملہ ہے، مفتی صاحب اور مولانا مرحوم میں "من تو شدم" والی بات نہ تھی، بالکل گھر کا معاملہ تھا۔ مولانا مرحوم کے بچے مفتی صاحب کو تایا جان کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے اور مفتی صاحب کی والدہ مولانا مرحوم کو بچا میاں کہہ کر مخاطب کیا کرتی تھیں۔ مولانا مرحوم نے کبھی کسی کتاب پر رائلٹی نہیں لی۔ ۱۹۶۶ء میں جب میری پہلی تصنیف ـــــ حیات الٰہی اور اس کا پس منظر ــــ ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئی تو میں ان دنوں دہلی میں تھا۔ اس کے پروف میں نے خود دیکھے تھے۔ مفتی صاحب نے حکیم ظفر احمد مرحوم سے کہا "اس بات کا خیال رکھنا کہ یہ کتاب ان کے لاہور جانے سے پہلے چھپ جائے اور انھیں اس کے ایک سو نسخے دے دینا۔ یہ اپنے ساتھ لے جائیں گے۔" چنانچہ میرے جانے سے پہلے کتاب چھپ گئی اور ان حکیم صاحب نے پچاس نسخے یہ کہہ کر میرے حوالے کئے کہ اتنی ہی جلدیں تیار ہو سکی ہیں۔ میں اپنی پہلی تصنیف چھپی ہوئی دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ مفتی صاحب نے مجھے مصنفین کی صف میں کھڑا کر دیا تھا، میں پچاس کتابیں لے کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ستان چلا آیا، اور وہ چند ہی دنوں میں دوست و احباب میں تقسیم کر دیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے ماموں زاد بھائی تھے اور مفتی صاحب کے ساتھ ان کی دوستی اس حد تک تھی کہ یک جان و دو قالب کی ضرب المثل ان پر صادق آتی تھی۔ مولانا حفظ الرحمٰن ندوۃ المصنفین کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کی تصانیف قصص القرآن اور اسلام کا اقتصادی نظام بڑے معرکہ کی کتابیں ہیں، موخر الذکر کتاب پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ایم اے اقتصادیات کے نصاب میں شامل ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کا انتقال ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ مولانا اکبرآبادی مرحوم نے راقم الحروف سے ایک بار ذکر کیا کہ اس وقت سے لے کر اپنی وفات تک مفتی صاحب ہر ماہ ایک معقول رقم ان کی بیوہ کو بھجواتے تھے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ تینوں حضرات مزاجاً ایک دوسرے کے بڑے قریب تھے۔ یہاں یہ ذکر بیجا نہ ہوگا کہ ہم مزاج ہونے کے علاوہ یہ تینوں ہم مرض بھی تھے اور تینوں کا انتقال بمرض سرطان ہوا۔

میں ایک بار برسات کے موسم میں اہل و عیال سمیت علی گڑھ گیا۔ مولانا اکبرآبادی مرحوم نے دریائے گنگا کے کنارے نرورہ میں ایک ریسٹ ہاؤس ریزرو کرایا۔ تمام اہل خانہ مع باورچی نرورہ پہنچے اور کئی روز وہاں ٹھہرے۔ ریسٹ ہاؤس ایک پہاڑی کے اوپر تھا اور نیچے گنگا بہتی تھی۔ قریب ہی گنگا پر بندھ باندھ کر ایک نہر نکالی گئی ہے۔ مولانا مرحوم کے باورچی کریم خاں کو مچھلیاں پکڑنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ وہ گنگا سے مچھلیاں پکڑ لاتا اور سالن تیار کر کے مولانا مرحوم کو کھلاتا۔ مچھلی اور بریانی ان کی کمزوری تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا نرورہ میں قیام کے دوران بار بار مفتی صاحب کو یاد کرتے اور فرماتے اگر مفتی صاحب بھی یہاں آجاتے تو چند روز آرام کر لیتے۔ ہم جتنے روز وہاں ٹھہرے مفتی صاحب کی یاد انھیں برابر ستاتی رہی۔

اگلے سال موسم گرما کی تعطیلات میں میں علی گڑھ گیا تو نرورہ کا پروگرام بنایا گیا۔ مفتی صاحب کو اس کی اطلاع کی گئی۔ موصوف علی گڑھ تشریف لے آئے اور اگلے روز ہم نرورہ روانہ ہو گئے۔ چار روز وہاں قیام رہا۔ شام کے وقت ہم لان میں بید کی کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ چائے بھی وہیں پیتے۔ عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں وہیں مفتی صاحب کی اقتداء میں ادا کرتے۔ ماحول بڑا خوشگوار تھا۔ بارش بھی وقفے وقفے سے ہوتی رہتی تھی کھانے کے وقت آم ضرور ہوتے تھے۔ شام کو آلو اور مچھلی کے پکوڑے تلے جاتے اور سبھی مزے لے لے کر کھاتے۔ صبح کے وقت گنگا کے پل پر جا کر دریا کا نظارہ کرتے۔

نرورہ کے چاروں اطراف میں ہندوؤں کی آبادی تھی۔ مفتی صاحب فرمانے لگے کہ یہاں صرف زمانۂ امن میں ہی آکر رہ سکتے ہیں ورنہ پتہ نہیں کس وقت کیا ہو جائے۔

مولانا اکبر آبادی کثیر العیال ہونے کے باوجود بڑے شاہ خرچ تھے۔ ایک بار اس موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی، مفتی صاحب فرمانے لگے "ان کے ہاتھ میں چھید ہے، اس لئے ان کے پاس پیسے نہیں رہتے۔"

مفتی صاحب کی یہ بڑی خدمت ہے کہ انھوں نے بہت سے اہل قلم کو جن کی علمیت کا آج علمی دنیا میں سکہ چلتا ہے، علمی حلقوں میں متعارف کرایا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا تقی امینی،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پروفیسر خلیق احمد نظامی، مولانا بدر عالم میرٹھی، پروفیسر محمد مسعود احمد، مولانا رشید نعمانی، مفتی ظفیر الدین مفتاحی، قاضی اطہر مبارکپوری، ڈاکٹر خورشید احمد فارق، ڈاکٹر ساجد علی خاں، مولوی محمد عبداللہ طارق، مولانا عامر [illegible] خواجہ عبدالرشید، ڈاکٹر حنیفہ رضی اور بیسیوں دوسرے اہل قلم برہان کے ذریعہ دینی حلقوں میں متعارف ہوئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نور اللہ مرقدہٗ کے بارے میں پوچھا "کیا حاجی صاحب بھی عالم ہیں؟" حضرت قاسم العلوم ؒ نے جواب میں ارشاد فرمایا "عالم ہونا کیا معنی، اللہ تعالیٰ نے ان کی ذات بابرکات کو عالم گر بنایا ہے" یہی جواب مفتی صاحب پر بھی صادق آتا ہے۔ آج کوئی اسکالر بام شہرت پر پہنچ کر مفتی صاحب کے احسان کا انکار کرے تو یہ تحدیث نعمت کے منافی ہوگا۔

ایک بار مفتی صاحب دفتر برہان میں تشریف فرما تھے کہ اردو شاعری پر بات چل نکلی۔ انھوں نے انیس و دبیر کا موازنہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک اجنبی آکر حضرت امام حسین رضؓ سے کہتا ہے۔ ع

اظہار اسم اقدس و اعلیٰ میں کیا ہے باک

امام صاحب نے اجنبی کو جو جواب دیا اسے دبیر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ع

فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں

دیکھیے دبیر نے اس مصرعے میں کتنی فاش غلطی کی ہے۔ اولاً یہ کہ حضرت امام عالی مقام ایک اجنبی سے اپنا تعارف کروا رہے ہیں۔ اس لئے اس میں عجز و انکسار کا اظہار ہونا چاہیے نہ کہ تعلّی۔ ثانیاً یہ کہ متکلم اپنے لئے واحد غائب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حسین علیہ السلام" کیسے استعمال کر سکتا ہے۔ اب دیکھیں انیس نے اسی مضمون کو کس طرح ادا کیا ہے:

یہ تو نہیں کہا کہ شہِ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

اب خود ہی اندازہ لگا لیں کہ انیس نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ (یہ شعر پڑھتے وقت مفتی صاحب نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھ کر سر کو قدرے جھکایا اور یوں اپنے ایکشن سے پوری تشریح کر دی)۔ اس کے بعد انھوں نے انیس کا یہ شعر پڑھا:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

پھر اس کی تشریح شروع کر دی کہ اوس اور شبنم میں کیا فرق ہے اگر یہاں اوس کی جگہ شبنم ہوتا تو شعر بے مزہ ہو جاتا۔ یہاں اوس لکھنا ہی مناسب تھا۔ انیس نے شبنم کا استعمال ایک مصرع میں یوں کیا ہے:

شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

یہاں اگر شبنم کی بجائے اوس لکھتے تو شعر پھسپھسا ہو جاتا۔ اب مجھے یاد پڑتا ہے کہ اُس موقع پر انھوں نے علم کے کتنے موتی لٹا ئے۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ ان کے اندر ایک ادیب چھپا ہوا ہے اور اگر موصوف علم دین کی طرف راغب نہ ہوتے تو ان کا شمار ملک کے چوٹی کے شاعروں، ادیبوں اور نقادوں میں ہوتا۔

ایک روز تصوف پر بات چل نکلی۔ میں نے عرض کیا "حضرت آپ کے والد ماجد تو بہت بڑے عارف باللہ تھے۔ آپ نے اس طرف توجہ کیوں نہیں فرمائی"۔ مفتی صاحب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے مسکراتے ہوئے فرمایا "میں سمجھتا ہوں کہ یہ نجات کا واحد راستہ نہیں ہے اور بھی کئی راستے ہیں۔" میں نے عرض کیا کہ آپ کے والد بزرگوار سے یہ سلسلہ آگے بھی چلا ہے؟" فرمانے لگے "مولوی اسحق صاحب میرٹھی اباجی سے بیعت تھے اور مولانا بدر عالم مولوی صاحب کے مرید تھے۔" میں نے مولانا محمد اسحق میرٹھی کے بارے میں زیادہ کرید مناسب نہ سمجھی۔ اب برہان کا مفکر ملت نمبر موصول ہوا تو یہ جان کر بےحد مسرت ہوئی کہ قاری محمد ادریس صاحب اُن کے پوتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی میری سمجھ میں آئی کہ قاری صاحب بلا ناغہ شام کو جامع مسجد نئی دہلی سے واپسی پر کیوں مفتی صاحب کے پاس آیا کرتے تھے۔ اگر مفتی صاحب موجود نہ ہوتے تو بھی قاری صاحب اس معمول میں فرق نہ آنے دیتے۔

مفتی صاحب کے جدِّ امجد حضرت شاہ فضل الرحمٰن عثمانی نور اللہ مرقدہٗ دارالعلوم دیوبند کے چھ بانیوں میں سے تھے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ان ہی کی دعوت پر دیوبند تشریف لائے تھے۔ مفتی صاحب کے والد بزرگوار حضرت مفتی شاہ عزیز الرحمٰن عثمانی قدس سرہ سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ میں صاحب نسبت بزرگ تھے اور پورے ملک میں ان کا فتویٰ چلتا تھا۔ ان کے ایک چچا حضرت حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اور بڑے دبدبہ والے بزرگ تھے۔ ان کے دوسرے چچا مولانا شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمت والرضوان پاکستان کے پہلے شیخ الاسلام، قائدِ اعظم کے معتمد ساتھی اور اپنے زمانے کے سربرآوردہ مفسر و محدث تھے۔ ان کی شرح مسلم شریف اور حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن حکیم پر حواشی ان کی علمی یادگاریں ہیں۔ پاکستان کی قومی اسمبلی میں قرارداد مقاصد، جس کی رو سے پاکستان کی قومی اسمبلی قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون پاس نہیں کر سکتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے محرک آپ ہی تھے۔ ان کے ایک چچا جناب مطلوب الرحمن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بھی صاحب دل بزرگ تھے۔ اس کے باوجود مفتی صاحب نے ابنائے زمانہ کی طرح اپنے بزرگوں کی استخواں فروشی سے مکمل اجتناب فرمایا۔ اب تو یہ دستور چل نکلا ہے اور "صاحبزادے" اپنے ناموں سے پہلے ابن الفلاں لکھ کر اپنے بزرگوں کے نام سے روٹی کما رہے ہیں۔ مفتی صاحب نے مولانا جامیؒ کا کلام بغور پڑھا تھا اور مرحوم خوب جانتے تھے۔ ؎

کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

انہیں یہ معلوم تھا کہ اگر ابن الفلاں ہونا ہی بڑے ہونے کی دلیل ہے تو کنعان اپنے نام سے پہلے ابن نوحؑ لکھ کر بڑا نہ ہو سکا۔ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ۔ مجھے مفتی صاحب دیوبندی حلقے میں واحد بزرگ نظر آ رہے ہیں جنھوں نے اپنی "صاحبزادگی" سے کوئی مالی منفعت حاصل نہیں کی۔ مجھے یاد آیا۔ ملتان میں تحریک ختم نبوت کے زیر اہتمام سید عطاء اللہ بخاری علیہ رحمۃ الباری کی صدارت میں جلسہ منعقد ہوا۔ مقررین میں ان کے فرزند ارجمند سید ابوذر ابومعاویہ عطاء المنعم بھی تھے۔ جب ان کے تقریر کرنے کی باری آئی تو اناؤنسر نے اعلان کیا، "حضرات اب آپ کے سامنے صاحبزادہ عطاء المنعم تشریف لاتے ہیں۔" سید عطاء اللہ بخاریؒ نے اناؤنسر کو مخاطب کر کے کہا، "بھائی، یہ میرا بیٹا ہے، صاحبزادہ نہیں، ابھی تو میرے نکاح کے گواہ بھی زندہ ہیں۔" اس سے اندازہ لگائیے کہ ہمارے اکابر "صاحبزادگی" کو کتنا معیوب سمجھتے تھے۔

میں نے ایک بار مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم سے یہ سنا کہ مفتی صاحب کے والد محترم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی نور اللہ مرقدہٗ سکندرہ تشریف لے گئے وہاں انھوں نے اکبر بادشاہ کی قبر پر مراقبہ کیا تو فوراً گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اٹھا اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے "بھاگو یہاں سے یہ تو عذابِ قبر میں مبتلا ہے۔" وقت گزرنے کے ساتھ میرے ذہن سے حضرت مفتی صاحب قبلہ کا نام محو ہو گیا اور میں نے یہ واقعہ حضرت مطلوب الرحمٰن عثمانیؒ سے منسوب کر دیا۔ میں نے ایک بار یہ واقعہ مفتی صاحب کے سامنے بیان کرکے اس کی تصدیق کرنا چاہی تو انھوں نے فرمایا "نہیں بھئی! یہ واقعہ تو خود ابا جی کے ساتھ پیش آیا تھا۔"

حضرت مفتی شاہ عزیز الرحمٰن عثمانیؒ روحانیت کے بڑے اونچے مقام پر تھے اور بڑی قوی نسبت رکھتے تھے۔ مفتی صاحب سے سنا ہے کہ جب ان کے جدِ امجد شاہ فضل الرحمٰن عثمانیؒ کے وصال کا وقت قریب آیا تو انھوں نے اپنے فرزند گرامی مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ سے کہا کہ وہ انھیں توجہ دیں۔ سعادتمند بیٹے نے اسے گستاخی پر محمول کیا لیکن والد بزرگوار کے اصرار پر ان کے پلنگ کے قریب ہو کر انھیں توجہ دی۔ اس پر شاہ فضل الرحمٰن نے فرمایا "الحمد للہ! میں دنیا سے خالی ہاتھ نہیں جا رہا۔"

ایک بار میں دہلی گیا۔ "منارِ صدا" ماضی قریب میں چھپ چکی تھی۔ مفتی صاحب نے ایک نسخہ یہ عبارت لکھ کر مجھے عنایت فرمایا "بگرامی خدمت برادرِ عزیز پروفیسر محمد اسلم صاحب، عتیق الرحمٰن عثمانی"۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مرحوم اپنے خوردوں سے کس طرح پیش آتے تھے۔

شیخ عبداللہ نے اپنے دورِ وزارت میں سری نگر میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے بارے میں سیمینار کروایا جس میں بھارت کے فضلاء بشمول حضرت قاری محمد طیب صاحب مرحوم و مغفور، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، مولانا احمد رضا بجنوری، مولانا اخلاق حسین قاسمی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور جناب بدر الحسن قاسمی نے گراں قدر مقالے پیش کئے۔ حکومت کشمیر کے محکمۂ اوقاف نے ان مقالات کو "تجلیاتِ انور" کے عنوان سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شائع کر دیا۔ مجھے ان دنوں مولانا الکشمیریؒ کے ساتھ بڑی عقیدت تھی اور یہ مولانا اکبرآبادی اور مفتی صاحب کی صحبت کا اثر تھا۔ (جب مولوی انظر شاہ نے ماہنامہ تجلی میں حضرت مولانا محمد طیب نانوتوی اور مولانا اکبرآبادی پر لکھے بیہودے سب و شتم کیا تو یہ عقیدت ختم ہو گئی۔) میں نے ان کے بارے میں عبدالرحمن کوندو، ازہر شاہ، انظر شاہ، مولانا محمد انوری لائلپوری، مولانا حامد الانصاری غازی اور قاری محمد رضوان اللہ کی تصانیف جمع کر لی تھیں اور خود محمد بشیر نامی اسکالر سے تھیسیس لکھوایا تھا۔ تجلیاتِ انور حال ہی میں شائع ہوئی تھی اور پاکستان میں دستیاب نہ تھی۔ یہ کتاب ہنوز دہلی کے تاجرانِ کتب کے پاس بھی نہیں پہنچی تھی۔ میں جس روز لاہور روانہ ہونے والا تھا مجھے یہ کتاب مفتی صاحب کے کمرے میں پڑی ملی۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ یہ کتاب مجھے دے دیں تو میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں اور وہ سری نگر سے دوسرا نسخہ بآسانی منگوا سکتے ہیں۔ مفتی صاحب نے بڑے سخت لہجے میں فرمایا "ہرگز نہیں"۔ مدتوں تک یہ معمہ لاینحل رہا کہ مفتی صاحب جیسے مشفق بزرگ نے، جو مجھے بیٹا اور داماد سمجھتے تھے، تجلیات انور دینے سے کیوں انکار کر دیا۔ اب کبھی سوچتا ہوں تو اسے ان کی کتاب دوستی اور مولانا الکشمیریؒ سے عقیدت پر محمول کرتا ہوں۔

اب اتفاق دیکھیے کہ پاکستان پہنچنے کے چند روز بعد سری نگر سے ایک ریسرچ اسکالر نے مجھے لکھا کہ اسے ڈاکٹر سیدہ اشرف ظفر صاحبہ کی تصنیف "سید علی ہمدانیؒ" کی اشد ضرورت ہے۔ سری نگر سے قیمت کی ادائیگی ممکن نہیں۔ میں نے اسے لکھا کہ یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے، میں مطلوبہ کتاب بھیج رہا ہوں، تم مجھے "تجلیاتِ انور" بھیج دو۔ یوں مجھے یہ کتاب مل گئی۔

ایک بار میں دیوبند میں تھا اور مفتی صاحب بھی شوریٰ کے اجلاس میں شرکت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی وجہ سے وہیں تھے۔ شام کے وقت میں عیدگاہ کی طرف نکل گیا۔ راستے میں ایک جوہڑ میں دو تین بھینسیں بیٹھی ہوئی تھیں اور بارہ تیرہ سال کی عمر کا ایک لڑکا ان کی رکھوالی کررہا تھا۔ اتنے میں اس کا باپ اسے تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس نے آتے ہی تڑاتڑ اپنے بیٹے کو بے نقط سنانی شروع کر دیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس دیہاتی کی زبان پر پنجابی کا بڑا اثر ہے۔ میں نے اس کا ذکر مفتی صاحب سے کیا تو انھوں نے فرمایا "پنجاب کے قرب کی وجہ سے پنجابی زبان کا اثر اس علاقے کی بولی پر ہے اور یہاں تشدید بہت استعمال ہوتی ہے۔"

سترہ اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے میں ندوۃ المصنفین میں مقیم تھا۔ انہی دنوں دیوبند میں شوریٰ کا اجلاس ہونے والا تھا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور شاہ فضل اللہ شارح ادب المفرد علی گڈھ سے دہلی پہنچ گئے۔ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی بھی وقت مقررہ پر جامعہ ملیہ سے دفتر برہان میں تشریف لے آئے۔ مفتی صاحب پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ میں بھی اس قافلے میں شامل ہوگیا۔ ٹرین صبح آٹھ بجے کے قریب روانہ ہوئی۔ جب ٹرین میرٹھ پہنچی تو قاضی صاحب یہ کہہ کر اتر گئے کر وہ اپنے گھر جا رہے ہیں اور اس کے بعد جانے والی ٹرین سے دیوبند پہنچ جائیں گے۔ میں بھی پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ مجھے چائے کی طلب تھی۔ میں نے چائے خریدی تو قاضی صاحب کی مجھ پر نظر پڑ گئی۔ انھوں نے فرمایا کر اس چائے کی قیمت وہ ادا کریں گے۔ میں نے اصرار کیا کہ نہیں میں اس کے دام ادا کروں گا۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ میرٹھ ہے۔ یہ ان کا وطن ہے۔ اس لئے وہی اس کی قیمت ادا کریں گے۔ قاضی صاحب قیمت ادا کرکے تشریف لے گئے۔ مجھے چائے پیتا دیکھ کر مفتی صاحب اور شاہ صاحب نے بھی چائے پینے کا اظہار کیا۔ شاہ صاحب اپنی جیبیں ٹٹولنے لگے۔ میں لپک کر ان کے لئے چائے لے آیا۔ مولانا اکبرآبادی ضرورت سے زیادہ نفاست پسند

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مدد میں مٹی کے آبخوروں میں چائے پیتا دیکھ کر کراہت کا اظہار کرنے لگے۔
میرٹھ سے ٹرین روانہ ہوئی تو مفتی صاحب سیٹ پر لیٹ گئے.........
ایک جگہ ٹرین رکی تو آنکھیں کھول کر مجھ سے
پوچھا "میاں! کونسا اسٹیشن آیا ہے" میں نے نام بتایا تو فرمانے لگے "ابھی دیوبند
پہنچنے میں دیر ہے" پھر ترتیب وار تمام ریلوے اسٹیشنوں کے نام گنوا دیئے جو
راستے میں آتے تھے۔

یہ ۱۹۸۰ء کی بات ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ مفتی صاحب دیوبند میں تھے۔ میں بھی وہیں پہنچ گیا۔ نماز مغرب کے بعد قبلہ مفتی صاحب غائب پائے گئے۔ عشاء کے قریب تشریف لائے تو میرے استفسار پر فرمایا "جامع مسجد کے سامنے میرے ایک عزیز ہیں شاہد حسین، بڑے تعلق والے ہیں، ان کی بہن کا نکاح تھا۔ برات منگلور سے آئی تھی۔ ان کا یہ اصرار تھا کہ نکاح میں پڑھاؤں، اس لئے وہاں گیا تھا، ورنہ ایسی جگہوں پر میں کب جاتا ہوں۔ میں نے وہاں کھانا نہیں کھایا، تمہارے ساتھ اور مولوی سعید کے ساتھ کھاؤں گا۔" میں نے عرض کیا میں شاہد صاحب کو خوب جانتا ہوں، فرمایا، "وہ کیسے؟" میں نے عرض کیا ان کے ایک ماموں لاہور میں رہتے ہیں۔ شاہد صاحب کبھی کبھی لاہور جاتے ہیں تو مجھ سے بھی ملاقات رہتی ہے۔

دیوبند کے جشن صد سالہ کے موقع پر میں بھی دیوبند حاضر ہوا۔ امرتسر سے مجھے سہ پہر کے وقت جنتا ایکسپریس ملی جس نے رات کے تین بجے کے قریب دیوبند پہنچایا۔ میں اسٹیشن سے ایک رکشا میں سوار ہو کر دارالعلوم کے مہمان خانے پہنچا۔ صدر دروازہ کھٹکھٹایا تو مولوی شمیم مرحوم آنکھیں ملتے ہوئے باہر نکلے۔ میں نے مولانا اکبرآبادی کے بارے میں دریافت کیا۔ میرا خیال تھا کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موصوف حسب معمول مہمان خانے میں قیام فرما ہوں گے۔ شمیم صاحب نے [illegible] ترشروئی سے جواب دیا کہ مجلس شوریٰ کے تمام اراکین دفتر ناظم تعلیمات میں قیام پذیر ہیں۔ مہمان خانہ غیر ملکی مہمانوں کے لئے مخصوص ہے۔ میں پوچھتے پوچھتے ناظم تعلیمات کے دفتر میں پہنچا۔ مدھم سی روشنی میں میں نے مولانا اکبر آبادی کو [illegible] لیا۔ ان کے پاؤں کو ہلایا تو مرحوم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ معانقہ اور مصافحہ کے بعد فرمایا کہ برابر والا پلنگ میرے لئے مختص ہے۔ اس وقت چار بج رہے تھے۔ فجر کی اذان ہونے والی تھی، نیند بھلا کیسے آتی؟ ساڑھے چار بجے اذان ہوگئی۔ میں وضو کے لئے چلا گیا واپس آیا تو تمام حضرات نماز کی تیاری میں مصروف تھے۔ قبلہ مفتی صاحب کو مصلیٰ امامت پر کھڑا کیا۔ انھوں نے اپنے مخصوص دلسوز لہجے میں قرأت فرمائی۔ نماز اور دعا کے بعد میں نے آگے بڑھ کر سلام عرض کیا۔ مجھے دیکھ کر فرمانے لگے "کب آئے؟" میں نے عرض کیا ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آیا ہوں۔ فرمایا "اچھا کیا یہ تقریب بھی تمہارے دیکھنے کی چیز ہے۔" اتنے میں ایک ملازم نمکین بسکٹ اور چائے لے آیا۔ چائے پر مفتی صاحب کے علاوہ مولانا اکبر آبادی، قاضی زین العابدین سجاد۔ مولانا حکیم محمد زماں حسینی، مولانا عبدالحلیم گوریٹی والے اور مولانا منت اللہ رحمانی بھی موجود تھے۔ تین چار روز ان حضرات کے ساتھ دیوبند میں صحبت رہی۔

دیوبند جانے سے دو تین ماہ پہلے میری ملاقات مولانا عزیز گل اسیر مالٹا سے ان کے گاؤں "سیری" نزد سخاکوٹ (مالاکنڈ ایجنسی) میں ہوئی تھی۔ میں نے ان کا انٹرویو لیا اور جب اس ملاقات کی روداد لکھنے بیٹھا تو اٹھارہ صفحے کا اچھا خاصہ مضمون تیار ہوگیا۔ دیوبند روانہ ہوتے وقت میں وہ مضمون اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے وہ مضمون مفتی صاحب کو دکھایا تو انھوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ مجھ سے لیا اور یہ مضمون کے اگلے شمارے میں ایک ہی قسط میں شائع کر دیا۔

ایک روز شیخ الہندؒ کے شاگرد رشید اور حلقۂ دیوبند کے معمر ترین بزرگ ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی، سابق صدر شعبۂ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی، جنھیں مفتی صاحب کے والد بزرگوار سے بھی شرف تلمذ تھا، ناظم تعلیمات کے دفتر میں تشریف لائے۔ مفتی صاحب نے ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے فرمایا "یہ بھی آپ کی طرح پروفیسر ہیں۔ اپنی کوئی تصنیف اگر ساتھ لائے ہیں، تو انھیں دیجئے۔ یہ تاریخ کے استاد ہیں۔" جب ڈاکٹر صاحب رخصت ہونے لگے تو مجھے اپنی قیام گاہ میں لے گئے اور "قائد بدر واحد" اپنے دستخطوں کے ساتھ مجھے مرحمت فرمائی۔

مفتی صاحب سیاسی اعتبار سے کانگرسی تھے اور موصوف جمعیۃ العلماء ہند کے اس گروپ میں شامل تھے جو تقسیم ہند کا سخت مخالف تھا۔ میں نے ان کا ایک فتویٰ پڑھا ہے جس میں موصوف لکھتے ہیں کہ ملک کا ایک حصہ دوسرے حصے کا محتاج ہے اور ملک کی منفعت اسی میں ہے کہ یہ متحد رہے۔ جس طرح چکی، ترازو اور قینچی ناقابل تقسیم ہیں اسی طرح ہندوستان بھی ناقابل تقسیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداء میں ان کا رویہ پاکستان کے بارے میں بڑا سخت تھا۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے "جب پاکستان قائم ہوا تو میرے چچا مولانا شبیر احمد عثمانی رح کراچی چلے گئے۔ وہاں جاکر انھوں نے مجھے بلانے کے لئے بڑا زور لگایا اور کئی خط لکھے، لیکن میں نہ گیا۔ انھوں نے کسی مدرسہ میں ناظم تعلیمات کا عہدہ سال بھر تک میرے لئے خالی رکھا۔ آخر انھوں نے تنگ آکر مجھے لکھا کہ تم یہاں کیوں نہیں آجاتے۔ میں نے جواب دیا۔ چچا جان آپ ہی نے ہمیں وہ حدیث پڑھائی تھی کہ جہاں طاعون پھیل جائے، وہاں نہ جانا چاہیئے۔ یہ پاکستان طاعون

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی تو ہے۔ اس کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے خط لکھنا بند کر دیا۔ جب مفتی صاحب بین الاقوامی سیرت کانفرنس میں شرکت کرنے کی غرض سے آئے تو اس سفر میں کراچی جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی بیوہ ان دنوں حیات تھیں موصوف اپنی چچی سے ملنے گئے۔ مفتی صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا "چچی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور چند روپے بھی دیئے۔" مفتی صاحب اس بات پر خوش تھے کہ ابھی ان کے سر پر کوئی بزرگ موجود ہے۔

ایک بار میں دفتر برہان میں بیٹھا تھا کہ اتنے میں خان غازی بھی وہاں چلا آیا۔ میں نے پوچھا کہ کیسے آنا ہوا۔ کہنے لگا "میں سال میں ایک بار سیاسی کارکنوں کی میٹنگ بلایا کرتا ہوں اس کے لئے چندہ جمع کرنا ہوتا ہے۔ مفتی صاحب بھی اس "عرس" کے لئے کچھ رقم دے دیا کرتے ہیں۔" مفتی صاحب نے حسب معمول کچھ رقم اس کے حوالے کی اور وہ رخصت ہو گیا۔

برہان کے مفکر ملت نمبر میں کئی جگہ اس کا ذکر آیا ہے کہ جب علماء دیوبند نے تحریک ترک موالات کے زمانے میں بدیشی مال کے بائیکاٹ کا فتویٰ دیا تو مولوی ظفر احمد تھانوی نے اس کے خلاف فتویٰ صادر کر دیا کہ بدیشی مال خریدنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔ دینی حلقوں میں اس فتویٰ کے خلاف ہیجان پیدا ہو گیا۔ دیوبند میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس فتویٰ کے خلاف غم و غصہ کا اظہار فرما رہے تھے لیکن دانستہ طور پر مفتی کا نام نہیں لے رہے تھے۔ مفتی صاحب کی جوانی کا عالم تھا۔ انھوں نے بڑی جرأت رندانہ سے کام لے کر بآواز بلند کہا "مولانا نام نہیں لے رہے ہیں۔ یہ فتویٰ مولوی ظفر احمد تھانوی نے صادر کیا ہے، جن کے والد (عبداللطیف) عیسائی ہو گئے تھے۔" مجمع پر ایک سناٹا چھا گیا۔ مفتی صاحب نے ایک سے زائد بار مجھ سے اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ادا کیا ہے۔

مفتی صاحب سیاسی اعتبار سے کانگریسی ضرور تھے لیکن وہ غیر مسلم کانگریسی رہنماؤں سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک لفظ بھی سننا پسند نہ فرماتے تھے۔ ایک واقعہ بیان فرماتے تھے کہ ایک جلسے میں مرارجی ڈیسائی (وزیر اعظم مقرر ہونے سے بہت پہلے) تقریر کر رہے تھے۔ مرارجی نے مسلمانوں کے خلاف کوئی بات کہی تو مفتی صاحب فوراً اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے:

"مرارجی اپنے الفاظ واپس لیں" انھوں نے انکار کیا تو مفتی صاحب نے فرمایا "آپ اپنے الفاظ واپس لیں ورنہ میں ابھی آپ کو بازو سے پکڑ کر اسٹیج سے نیچے اتار دوں گا۔" یہ تھی ان کی غیرت ایمانی کہ اپنے ایک دیرینہ سیاسی رفیق سے مسلمانوں کے خلاف ایک لفظ نہ سن سکے۔

گاندھی جی کی تحریک نمک سازی اور ڈانڈی مارچ کے زمانے میں مفتی صاحب جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مقیم تھے اور انھوں نے اس زمانے میں دو تاریخ ساز فتوے جاری کیے۔ اولاً یہ کہ جس سیاسی کارکن کی جائداد بحق سرکار ضبط کی جائے کسی شخص کے لئے اس کا خریدنا شرعاً حرام ہے۔ ثانیاً یہ کہ پانی نمک اور گھاس پر کوئی ٹیکس عائد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کی منفعت سب کے لئے یکساں ہے۔ اسی زمانے میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے بھی ایک حدیث سے یہی استدلال کیا تھا۔ گاندھی جی کی تحریک کو مفتی صاحب کے فتوے سے بڑی تقویت ملی اور یہی فتویٰ گاندھی جی کے ساتھ ان کے تعارف کا سبب بنا۔ مفتی صاحب کو اپنی حق گوئی کی بڑی قیمت ادا کرنا پڑی اور کارکنانِ مدرسہ نے انھیں استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔

ایک مرتبہ جولائی میں لاہور سے علی گڑھ گیا اور چند روز میں رمضان شروع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوگیا۔ علی گڑھ میں تو یقیناً باقاعدگی کے ساتھ روزے رکھتا رہا اور ...
میں بھی شریک ہوتا رہا۔ علی گڑھ سے دہلی گیا تو روزے ترک کر دیئے۔ میرا قیام ...
حسبِ معمول دفتر برہان ہی میں تھا۔ مفتی صاحب فرمانے لگے "مسافر کو رخصت ہے ...
اچھا کیا کہ سفر میں روزے ترک کر دیئے۔ ورنہ بہت تکلیف ہوتی۔" بہادر گڑھ ...
دفتر برہان کے اس برآمدے میں جہاں مفتی صاحب کی نشست ہوا کرتی تھی ...
کو میرے لئے پلنگ بچھا دیتے۔ میں بستر پر دراز تھا کہ مفتی صاحب نماز تراویح ...
فارغ ہو کر تشریف لائے۔ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مفتی صاحب فرمانے لگے "...
میاں ناشتہ کس وقت کرو گے؟ آٹھ بجے ٹھیک رہے گا؟" میں نے عرض کیا ...
حضرت میں روزہ نہیں رکھتا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آپ روزہ ...
ناشتہ کرائیں۔ اس پر فرمانے لگے "میاں تم مسافر ہو۔ تمھیں رخصت ہے۔ آ...
اس میں حرج ہی کیا ہے؟ آخر ناشتہ تو کہیں کرو گے، پھر یہیں کر لینا۔ اگر سحر...
کے وقت چائے پینا پسند کرو، تو میں لے آؤں۔" میں نے بصد عجز معذرت ...
اور بڑی مشکل سے انھیں ناشتہ لانے سے باز رکھا۔ مرحوم بار بار فرماتے ...
"میاں تمھیں رخصت ہے۔ جب رخصت ملے تو اس سے ضرور فائدہ اٹھانا چا...
خواہ مخواہ خود کو تکلیف میں ڈالنے سے کیا فائدہ؟"

یہ ان کی وسیع القلبی اور تفقہ فی الدین کی بہترین دلیل ہے۔ ان کی جگہ
کوئی عالم دین ہوتا تو روزہ خور مسافر کو گھر سے نکال دیتا اور یہاں ناشـ...
لانے پر اصرار ہو رہا تھا۔ اللہ اکبر۔ کیسے لوگ تھے یہ۔ ع

اب ڈھونڈو انھیں چراغِ رخِ زیبا لے کر

مفتی صاحب کی حیات میں میں پندرہ سولہ مرتبہ دہلی گیا ہوں گا۔ قیام ...
ان ہی کے ہاں ہوا کرتا تھا۔ ایک بار میں ہوٹل میں ٹھہر گیا تو بہت ناراض ہو...

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لئے بطور خاص دفتر برہان میں منگوالیا۔ خود صاحب کھانے پر اصرار کرتے۔
عرض کرتا کہ میں چند دن کے لئے یہاں آیا ہوں۔ مجھے بہت جگہ جانا ہے۔
۔ کھانے کے وقت اپنا پروگرام درمیان میں چھوڑ کر یہاں آنا ہوگا۔ اس
یہ پابندی میرے لئے مشکل ہے۔ اس پر بھی ایک بار شاندار ضیافت کرتے۔
کی اہلیہ منیبہ خاتون، جنھیں ہم منی آپا کہتے ہیں، کئی طرح کے کھانے
ر کرتیں۔ مفتی صاحب مجھے دفتر سے اپنے گھر لے جاتے، منی آپا کا سلام پہنچاتے۔
انا شروع ہوتا تو اصرار کر کے مختلف چیزیں کھلاتے۔ ایک بار سیخ کباب بھی
ستر خوان پر موجود تھے۔ کبابوں کی پلیٹ میری طرف بڑھا کے فرمایا "میاں!
سیتا کبابی کے ہاں سے منگوائے ہیں۔ میرٹھ کا رہنے والا ہے اور بڑا عمدہ
باب بناتا ہے۔ میں نے ہی اصرار کر کے اسے یہاں رکھا ہوا ہے۔ ذرا چکھ کر
یکھو۔" صبح ناشتے کے وقت گھر سے چائے، مکھن توس اور انڈہ لاتے، مٹیا محل
ے پوریاں اور حلوہ منگواتے اور پھر اصرار کر کے کھلاتے۔ اگر میں عرض کرتا کہ
پ بھی کچھ لیجئے تو فرماتے "میں بہت صبح ناشتے سے فارغ ہو جاتا ہوں۔ یہ
ماسے لئے ہے۔"

وفات سے چند ماہ پہلے میں دہلی گیا۔ حسب معمول ندوۃ المصنفین میں قیام
۔ گھر پر ان کی عیادت کے لئے حاضر ہوا۔ اپنی عادت کے مطابق بڑے تپاک سے
ے۔ گھر کے ایک ایک فرد کی خیریت دریافت کی۔ اتنے میں حمید میاں اور ایک اور صاحب
ن کا نام اب یاد نہیں پڑتا، انھیں ایکسرسائز کرانے لگے۔ میں پاس بیٹھا تھا
رمانے لگے "اب میں اچھا ہو رہا ہوں۔ ذرا سی کمزوری باقی ہے۔" میں نے تسلی
یتے ہوئے عرض کیا کہ یہ بھی جاتی رہے گی۔ اتنے میں پتہ نہیں جی میں کیا آیا فرمانے
لگے "کل شام کا کھانا یہیں کھا لینا۔" میں نے عرض کیا "حضرت کھانا تو بہت کھایا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ جب آپ تندرست ہو جائیں، پھر کھائیں گے۔ میں تو [illegible] فرمانے لگے "پھر کیا ہوا۔ آج یہیں تو کھانا کھاؤ گے، یہیں کھا لینا۔" ان کے اصرار پہ چپکے مان گیا۔ اگلے روز شام کو میں کھانے پر حاضر ہوا۔ اپنے پلنگ کے قریب ایک کرسی پہ مجھے بٹھایا اور میز پہ کھانا چنا گیا۔ میں کھانے بیٹھا تو فرمانے لگے "میاں تکلف سے کام نہ لینا۔" میں جتنی دیر وہاں رہا، بڑی شفقت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے رہے۔

میں احباب کے لئے تحائف لے گیا تھا۔ ان میں ریشمی جاپانی کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی تھا جس سے ایک زنانہ قمیص تیار ہو سکتی تھی۔ میں نے وہ کپڑا مفتی صاحب کو تھماتے ہوئے کہا "یہ ریحانہ نے منی آپا کے لئے بھیجا ہے۔" مفتی صاحب نے وہ کپڑا منی آپا کو بھجوا دیا۔ اگلے روز ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے "وہ کپڑا بہت عمدہ ہے۔ منی نے شکریہ ادا کیا ہے"۔ میں نے عرض کیا اس میں بھلا شکریہ کی کیا بات ہے۔ میں کئی بار مفتی صاحب کے لئے "جاٹنا" کے بنے ہوئے پن (قلم) جو پاکستان میں بارہ تیرہ روپے میں مل جاتا ہے، لے گیا۔ انھوں نے ہمیشہ اسے استعمال کیا۔

چند روز بعد میری اہلیہ بچوں کے ہمراہ دہلی گئیں۔ قیام [illegible] شمس کاہنچ چیلمس والان میں جناب عبدالقدیر کے ہاں تھا۔ ایک روز مفتی صاحب کی عیادت کو حاضر ہوئیں۔ مفتی صاحب انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور منی آپا سے کہنے لگے "منی ذرا خیال رکھنا یہ میرے نواسے نواسیاں ہیں، خالی ہاتھ نہ جائیں۔" میری اہلیہ نے عرض کیا "تایا جان رہنے دیجئے۔ آپ پہلے تندرست ہو جائیں پھر دیکھا جائے گا۔ اتنا روپیہ علاج پر اٹھ رہا ہے۔" فرمانے لگے۔ "یہ تو ہوتا ہی رہے گا۔ یہ بچے ہیں، ان کا خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگتا۔" منی آپا سو روپے کا نوٹ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں اور مفتی صاحب نے اپنے ہاتھوں سے یہ رقم بھجوانے کے لئے دی۔

ایک روز مفتی صاحب کسی کام کی غرض سے دیوبند روانہ ہونے لگے۔ میں نے معلوم کیا کہ جب موصوف دیوبند جاتے ہیں تو وہاں نماز قصر ادا کرتے ہیں؟ اس پر فرمایا "میں دیوبند کو اپنا وطن سمجھتا ہوں، دہلی میرا دوسرا وطن ہے۔ ابھی تک میں نے دیوبند کی سکونت ترک نہیں کی، اس لئے وہاں قصر نماز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں بھارت کے ہر سفر میں ایک پہاڑی مقام ضرور دیکھتا تھا۔ ایک بار مفتی صاحب فرمانے لگے "کبھی چکروتہ بھی ہو آتے۔" میں نے یہ نام پہلے نہیں سنا تھا اس لئے اس کا محل وقوع دریافت کیا۔ مفتی صاحب فرمانے لگے "سہارنپور سے راستہ جاتا ہے۔ جب مولانا حفظ الرحمن بیمار ہوئے تو بحالی صحت کے لئے کچھ عرصہ کے لئے مرحوم چکروتہ چلے گئے تھے۔ میں اور مولوی سعید بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہاں جانے والے راستے میں بڑے چکر آتے ہیں۔ اس لئے اس کا نام چکروتہ یعنی "چکر آتا" پڑ گیا۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جب برہان کا مفکرِ ملت نمبر نکلنے والا تھا تو برادرم عمید الرحمٰن کی تاکید اکید کے باوجود میں مفتی صاحب کے بارے میں کچھ نہ لکھ سکا۔ میں کئی بار کاغذ اور قلم لے کر بیٹھا لیکن ہر بار بے کیف ہو کر اٹھ گیا۔ اب ان کے بارے میں اپنے مشاہدات و تأثرات لکھنے بیٹھا تو ایسا محسوس ہو رہا ہے گویا ذہن میں پردۂ سکرین کی طرح فلم چل رہی ہے اب ان کی زندگی کے مختلف گوشے میرے سامنے آ رہے ہیں۔ اب اس مضمون کو سمیٹنا مشکل ہو رہا ہے۔

مفتی صاحب ایسے نابغۂ روزگار بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عمرہا باید تا یک مرد حق پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

اب وہ سانچے ہی نہیں رہے جن میں ان بزرگوں کی سیرت اور کردار ڈھلے تھے۔ جیسے بلند پایہ اساتذہ انھیں میسر آئے تھے اب ان کی پرچھائیں بھی نظر نہیں آتی۔ جس ماحول میں ان بزرگوں نے آنکھیں کھولی تھیں اب ویسا پاکیزہ ماحول کیسے میسر آسکتا ہے۔ مفتی صاحب اپنی سیرت و کردار کے انمٹ نقوش جریدۂ عالم پر ثبت کرکے جوار رحمت میں ابدی نیند جا سوئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم کس حد تک ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

دفتر برہان موجود ہے۔ برہان ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ندوۃ المصنفین قائم و دائم ہے۔ وہ کرسی جس پر مفتی صاحب بیٹھا کرتے تھے ہنوز اپنی جگہ پر اسی حالت میں پڑی ہے۔ دفتر کا عملہ بھی موجود ہے لیکن صاحب خانہ موجود نہیں۔ انھوں نے ایک تعزیتی جلسے میں نظیر اکبرآبادی کا یہ شعر پڑھا تھا۔ میں اسی شعر پر مفتی صاحب کا ذکر خیر ختم کرتا ہوں ؎

مے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے، ساقی نہیں
جی میں آتا ہے لگا دیں آگ میخانے کو ہم

© rasailojaraid.com